بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جذبۂ فنا کے کئی ایک مدارج اور متعدد صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی شخص کسی اعلیٰ اور ارفع نصب العین کو اپنا کر اس میں اس طرح کھو جائے کہ اسے اپنے وجود تک کی بھی خبر نہ رہے یا کسی پاکیزہ سیرت و کردار رکھنے والے شخص کی سیرت کی پاکیزگی اس کے دل و دماغ کو اس حد تک متاثر کر دے کہ وہ اس میں بالکل جذب ہو کر رہ جائے۔

جذبۂ فنا کی اِن دونوں صورتوں میں جو صورت بھی ہو مگر ان میں ایک چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ انسان اس جذبے سے تعمیر و ترقی کا کام لیتا ہے۔ نصب العین میں "فنائیت" اس کے اندر بے پناہ قوت، لازوال عزم اور مقصد کے حصول کے لیے غیر معمولی جذبۂ ایثار پیدا کرتی ہے اور پاکیزہ سیرت و کردار رکھنے والی شخصیت کے اندر فنائیت اس کی اپنی سیرت کو پاکیزہ بنا دیتی ہے۔

یہ جذبۂ فنا اگر ایک طرف اپنے اندر خیر کے متعدد پہلو رکھتا ہے تو دوسری طرف اس میں شر کے بھی بے شمار پہلو پائے جاتے ہیں۔ جب نصب العین گھٹیا اور مقاصد ناپاک ہوں تو پھر جو افراد اور قومیں ان میں اپنے آپ کو کھو دیتی ہیں وہ بھی افکار و نظریات اور سیرت کے اعتبار سے انتہائی پست سطح پر اتر آتی ہیں اور نہ صرف اپنے آپ کو برباد کرتی ہیں بلکہ قوموں اور نسلوں کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ یہی حال بدقماش، فساق و فجار اور حامیانِ ظلم و استبداد کے عشق میں فنا ہونے والوں کا ہوتا ہے۔ ان کا جذبۂ فنا انہیں بربادی کے ان مہیب غاروں میں دھکیل دیتا ہے جن میں ان کے "مثالی انسان" ان سے پیشتر گر کر تباہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

اسے قدرت کی ستم ظریفی کہیئے کہ تعمیر و ترقی کے معاملے میں تو کوئی فرد یا قوم اپنے نصب العین سے بڑھ

کہ کبھی کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتی بلکہ اپنے سارے اخلاص کے باوجود مکمل نصب العین تو کیا اس کا ایک حصہ بھی بمشکل حاصل کرتی ہے۔ یہی صورت حال نیک افراد کی بلند سیرتوں کو اپنانے کے معاملے میں پیش آتی ہے۔ "فنا فی الشیخ" کا جذبۂ صادق رکھنے کے باوجود مسترشد مرشد کے سارے اوصاف کو کماحقہٗ اپنے اندر پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مگر اس کے برعکس جب کوئی فرد اور قوم پست مقاصد اور گھٹیا انسانوں کے عشق میں کھو جائے تو وہ پستی اور گھٹیا پن میں ان پستیوں سے کہیں زیادہ نیچے گر جاتی ہے جو آغاز سے اس کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انسان سربلند تو مشکل سے ہوتا ہے مگر پستی کی طرف بڑی سرعت سے لڑھک جاتا ہے۔ چنانچہ جن افراد اور قوموں نے کسی ارفع و اعلیٰ نصب العین کو اپنا کر تعمیر و ترقی کی راہ اختیار کی انہیں قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں اور ان کے مقابلے میں جن لوگوں نے تخریب اور تنزل کو اپنی منزل ٹھہرایا انہوں نے بکمال عجلت ملکوں اور قوموں کو برباد کر کے رکھ دیا۔

اسے اس ملک کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ مقاصد اور سیرت و کردار کے ارفع نمونوں کو اپنانے کا جذبہ اور رجحان قریب قریب ختم ہوتا جا رہا ہے اور ناپاک مقاصد کی پیروی اور خدا سے غافل انسانوں کے طرز فکر اور طرز عمل کو اپنانے کا جذبہ بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے خصوصاً اس ملک کے برسر اقتدار طبقوں کے اندر یہ رجحان تو فنائیت کی حد تک نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس پستی تک خدا کے نافرمان بندے اپنی ساری بداعمالیوں کے باوجود صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پہنچے ہم اس منزل تک بہت جلد پہنچ گئے ہیں۔ اور اگر ہمارے "اشراف کی" فریفتگی کا یہی حال رہا تو ہم نہ صرف خدا کے ان نافرمانوں کی ساری برائیاں بڑی تیزی کے ساتھ پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیں گے بلکہ فسق و فجور، ناانصافی، ظلم و استبداد، حرص دنیا اور بے اصولے پن میں ان سے بھی اس حد تک آگے بڑھ جائیں گے کہ خود انہیں ہمارے کرتوتوں کو دیکھ کر وحشت ہو گی

تہذیب مغرب کے عشق میں مبتلا ہمارے ملک کی "موثر اقلیت" نے، جو غالباً ہماری شامت اعمال کی بنا پر، اول روز ہی سے پاکستان کی ہیئت حاکمہ بھی چلی آ رہی ہے، ہمارے معاشرے کو بڑی سرعت کے ساتھ مغربی اقدار کے سانچوں میں ڈھال دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے والی

قوم کے دل و دماغ پر اب لندن، پیرس، ماسکو اور واشنگٹن کے معاشروں کی پیروی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اگر آپ مغربی تہذیب کے ساتھ اس کے اس جذبۂ فنا کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس نے مغرب کے ساتھ گہری محبت و عقیدت کے باوجود صرف اس تہذیب کی برائیوں کو ہی اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی کسی اچھائی کو اپنانا تو کجا اُسے اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ جب رخ پستی کی طرف ہو اور ذہنی میلان بھی پست ہی ہو تو بلندی کی طرف آخر انسان کیونکر بڑھ سکتا ہے۔ مغربی تہذیب بھی دوسری مادی تہذیبوں کی طرح پہلودار تہذیب ہے۔ اس کے اندر تخریب کے لاتعداد پہلوؤں کے ساتھ کچھ پہلو تعمیر کے بھی ہیں کیونکہ اگر اس میں تعمیر کے یہ پہلو نہ ہوتے تو وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے آپ کو برقرار نہ رکھ سکتی۔ لیکن ہمارے "اشراف" اُس کے جس پہلو پر فریفتہ ہوئے ہیں وہ اس کی "لذت پرستی" ہے۔ اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ ہماری قوم کی اکثریت ان بلند اور پاکیزہ مقاصد سے جن کی بناء پر ہمیں بارگاہِ ایزدی سے "امتِ وسط" کی خلعت عطا ہوئی تھی ____ ناآشنا ہو کر حرص و آز کی غلام بنتی جا رہی ہے۔ جب کسی قوم کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین موجود نہ رہے اور اس کی جدوجہد کی حدِ کمال چند لذات کا حصول قرار پائے تو اس سے نہ صرف اس کے اخلاق تباہ ہوتے ہیں بلکہ اس کے ضمیر پر بھی موت طاری ہو جاتی ہے۔ مذہب کے ساتھ تعلقِ خاطر کے باوجود اس کی عملی زندگی میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جسے دیکھ کر یہ کہا جا سکے کہ یہ قوم کسی متعین اسلوبِ حیات کی علمبردار ہے اور اس اسلوبِ حیات کی وجہ سے اِس کے افراد حلال و حرام اور پسند و ناپسند کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور اس نقطۂ نظر سے ہٹ کر وہ کبھی کوئی ایسا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے جس سے اس امتیاز کے مٹ جانے کا خطرہ ہو۔

پاکستانی قوم میں لذت پرستی کے جنون نے مادہ پرستی کی راہ ہموار کی ہے۔ اور اس کے اخلاق کی جڑوں کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے اور اسے اس حد تک بے ضمیر بنا دیا ہے کہ اس کی ایک بہت بڑی اکثریت معمولی سے دنیوی مفادات کی خاطر بڑے سے بڑے دینی اصول اور اخلاقی ضابطے کو نظرانداز کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ عوام و خواص دونوں ان ذرائع و وسائل کے حصول میں منہمک ہی نہیں بلکہ جذبۂ فنا کی منازل طے کرتے نظر آتے ہیں خواہ اس انہماک و استغراق میں انہیں ایمان جیسی متاعِ گراں مایہ ہی سے ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں۔ ایک انسان کی زندگی میں اصل اہمیت اس چیز اور اصول کو حاصل ہوتی ہے جسے وہ

سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے اور جس کے سامنے وہ دنیا کی ہر دوسری چیز کو ہیچ سمجھتا ہے۔ مسلم قوم کو جب متاعِ ایمان سب سے زیادہ عزیز تھی تو وہ دنیا کی ہر دوسری متاع کو اس کے لیے قربان کرنے پر آمادہ رہتی تھی اور کبھی اس بات کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بڑے سے بڑے دنیوی نفع کے لیے اسے نظرانداز کر دے گی۔ دنیوی مال و اسباب تو کیا ایمان کے مقابلے میں اس کے افراد جان کو بھی کسی قدر و قیمت کا حامل نہ سمجھتے تھے اور جان دے دینے کے بعد بھی زبانِ حال سے یہی کہتے تھے:

"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" مگر آج چونکہ نصب العین کا محور تبدیل ہونے سے فکر و نظر کے زاویے، خوب و ناخوب کے پیمانے اور بھلائی اور برائی کے معیارات اور جدوجہد کے رخ بدل گئے ہیں اس لیے اب حال یہ ہو گیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے دنیوی فائدوں کی خاطر بڑی بے تکلفی کے ساتھ ایمان اور ضمیر کے سودے کیے جاتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک معمولی سی اقلیت کو چھوڑ کر اس ملک کی عظیم اکثریت کا ضمیر ایک قابلِ بیع و شری چیز بن کر رہ گیا ہے۔ وہ لوگ جو معاشرے میں کوئی موثر قوت نہیں رکھتے انہیں معمولی سا لالچ اور دباؤ اپنے ضمیر کے خلاف فیصلہ کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے اور جو معاشرے میں ذرا نمایاں مقام رکھتے ہیں انہیں ان کے حسبِ مرتبہ مناصب یا بعض دوسری مراعات جادۂ مستقیم سے بآسانی ہٹا سکتی ہیں۔ بات اگرچہ بڑی تلخ ہے مگر ہے حقیقت کہ ہمارے ملک کے فرمانرواؤں نے عوام و خواص کو باضمیر انسان بننے کی تربیت دینے کے بجائے ضمیر کو باقاعدہ بیچنے کے ڈھنگ سکھائے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں سیر چشم، قانع، بااصول، غیرت مند اور باضمیر انسانوں کی تشویشناک حد تک کمی ہو گئی ہے اور ان کی جگہ طالع آزماؤں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قوم کی ایک بھاری تعداد ضمیر کو منڈی کا مال سمجھ کر ہمیشہ گاہکوں کی تلاش میں رہتی ہے کہ کب کوئی اس کا سودا چکا کر اسے اپنی تحویل میں لے لے۔ مگر ضمیر کے گاہک بھی غالباً اپنے ضمیر بیچ کر اس شعور اور احساس سے یکسر محروم ہو چکے ہیں کہ جن لوگوں کے ضمیر آج بناسپتی گھی کے چند ڈبوں اور کھانڈ کے چند سیروں یا زیادہ سے زیادہ چند پرمٹوں یا بھتیجوں، بھانجوں اور بیٹوں کو ملازمت دلوانے کے عوض خریدے جا سکتے ہیں کیا وہ یہ ضمیر کل دوسرے گاہکوں کے ہاتھ جہاں سے انہیں بہتر قیمت وصول ہونے کی توقع ہو ــــ بیچنے پر تیار نہ ہوں گے۔ ضمیر کو جب ایک مرتبہ منڈی کا مال بنا دیا جائے تو پھر اس کے فروخت کنندگان اس بات سے بے نیاز ہو جاتے ہیں کہ کون کس وقت اسے خرید رہا ہے انہیں تو اسے بیچنا

ہی ہے جو زیادہ دام ادا کرے وہ اسے بخوشی اس کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اس وقت جو خوفناک سیاسی بحران پیدا ہوا ہے اس کے اسباب کا اگر کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا سب سے اہم سبب قوم کو بے ضمیر بنانے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش ہے۔ ایک فرد یا مختصر سے گروہ نے اقتدار پر قبضہ کرنے اور قبضہ کرنے کے بعد اس کے ساتھ چپکے رہنے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ ہر جائز اور ناجائز طریق سے ان تمام افراد اور گروہوں کو خرید لیا جائے جو اس کے لیے کسی وقت بھی وجہ پریشانی بن سکتے ہیں۔ اِدھر ان افراد اور گروہوں کی بہت بڑی تعداد نے دنیوی مفادات کے حصول اور پھر ان کے تحفظ کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ کسی طرح حکومت کے ایوانوں میں ان کی رسائی کا کوئی سامان پیدا ہو اور اس طرح معاشرے اور انتظامیہ میں انہیں اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے مواقع میسر آ سکیں تاکہ وہ اس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ دنیوی منافع حاصل کر سکیں اور کسی میں یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہو کہ حضور مال و متاع کی صورت میں یہ جو کچھ اکٹھا کیا جا رہا ہے اس کے لیے آپ کے پاس کونسا اخلاقی اور قانونی جواز ہے۔ ضمیر کی اس سودا بازی نے سب سے پہلے مسلم لیگ کو تباہ کیا۔ اس کی تباہی کے بعد پھر یہ ضمیر لوگ ریپبلیکن پارٹی کی طرف ٹوٹ پڑے اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ یہ فنا کے گھاٹ نہ اتر گئی۔ پھر جب فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب نے تخت اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد کنونشن لیگ کی تشکیل کی تو نفس کے یہ بندے بڑی عقیدت کے ساتھ جوق در جوق اس میں داخل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے بظاہر یہ ایک مضبوط پارٹی بن گئی مگر اس کی قوت اور شان و شوکت کا سارا دار و مدار صرف فیلڈ مارشل صاحب کا تخت شاہی پر فائز ہونا تھا۔ جب ان کا سنگھاسن ڈولتا دکھائی دیا اور بھٹو صاحب مستقبل قریب میں حکمران بنتے نظر آئے تو یہی لوگ کنونشن لیگ کو دغا دے کر پیپلز پارٹی میں آ شامل ہوئے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے دوسروں کے خلاف سازشیں کرنے لگے اور ایک دوسرے سے بڑھ کر صاحبِ اختیار کو اس امر کا یقین دلانے لگے کہ ان کا اگر اس ملک میں کوئی شفیق خیر اندیش اور بہی خواہ ہے تو یہ ناچیز خادم ہی ہیں۔ باقی سب اُن کے بداندیش اور دشمن ہیں۔ اس لیے اُن کی نظرِ کرم کے صرف وہی مستحق ہیں۔ اس قسم کی ذہنی اور اخلاقی فضا میں اہلِ پاکستان کا جو قومی کردار بن سکتا ہے اسے سمجھنے کے لیے کسی عمیق مطالعہ اور مشاہدے کی ضرورت نہیں۔ ہر وہ شخص جو اس ملک میں زندگی کے دن پورے

کررہا ہے۔ وہ خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بخوبی اندازہ کرسکتا ہے۔

اگر اس ملک کے "اشراف" نے ایک طرف معاشرے کے اندر غلط رجحانات کو جنم دیا ہے تو دوسری طرف اپنے آپ کو بھی ایسے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی اندھی عقیدت میں گرفتار کیا ہے جن کے کارنامے انسانی تاریخ میں سیاہ ابواب کے عنوانات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں تو خیر ایک اچھی خاصی تعداد ایسے فرمانرواؤں کی رہی ہے جو اپنی نیکی، پاکبازی، حسنِ اخلاق اور خداخوفی کی بنا پر فرمانرواؤں سے کہیں زیادہ درویش کہلانے کے مستحق تھے اور جن کی غیر معمولی فائدانہ اور انتظامی صلاحیتوں نے اسلامی قلمرو کو "جنتِ ارضی" بنا دیا تھا، مگر دوسری قوموں میں بھی بعض ایسے حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے جن کی وجہ سے انسانیت کو جوروجفا سے چھٹکارا حاصل ہوا اور راسے سکھ اور چین کی زندگی نصیب ہوئی۔ ہمارے ملک کے اصحابِ اقتدار کے دلوں میں ان نیک نفس حکمرانوں میں سے کسی حکمران کی پیروی کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی نظروں میں ہر پھر کر ہٹلر، مسولینی، لینن اور سٹالن جیسے جابر حکمران ہی بطور آئیڈیل سماتے ہیں اور وہ تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے لیے قریب قریب وہی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں جو وہ اپنے عہدِ اقتدار میں اختیار کرتے رہے ہیں اور عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد اُن کے طور طریقوں کو ہی وہ اپنے لیے نمونہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے افکار و نظریات اور ان کی حرکات و سکنات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ جابر اور ظالم حکمران ان کے روحانی اور سیاسی پیشوا ہیں اور اُن کی محبت اور عقیدت میں یہ درجہ فنا تک پہنچے ہوئے ہیں۔

ان جابر حکمرانوں کی کارگزاریوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو بعض رجحانات زمان و مکان اور معاشرتی و سیاسی حالات کے وسیع اختلافات کے باوجود سب میں مشترک نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلا رجحان جو دنیا کے سارے آمروں میں بڑی نمایاں حیثیت سے پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ قوم کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کرنے کے بجائے اُسے سطحی جذباتیت اور کھوکھلے نعروں کا خوگر بنایا جائے تاکہ وہ فہم و تدبر کے ساتھ کوئی قدم نہ اٹھا سکے اور جذباتی اور خوش کن نعروں کے سحر میں ہمیشہ گرفتار رہے اور جو شخص بھی زبان کے استعمال کے معاملے میں مطلق العنان، بلند بانگ دعوے کرنے میں ماہر ہو اور عوام کے جذبات

سے کھیلنے میں مشاق ہو وہ بلا سوچے سمجھے اور حقائق سے یکسر بے پروا ہو کر اُس کے پیچھے چل پڑے، اور جن کے پیچھے وہ اندھی ہو کر چل رہی ہے اُن سے یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ حضور! آخر آپ ہمیں کس منزل کی طرف لے جا رہے ہیں؟ اگر قوم کے جذبات میں اشتعال اور ہیجان کے بجائے ٹھہراؤ اور توازن ہو اور وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے کا فیصلہ عقل و فکر کی معتدل میزان پر تول کر کرنے کی عادی ہو تو اس قوم میں کبھی فرعون، نمرود، شدّاد پیدا نہیں ہوتے اور اگر کوئی سر پھرا یہ ناپاک عزم لے کر اٹھے بھی تو جلد ہی اس کی مذموم کوششوں کو ناکام بنا دیا جاتا ہے۔ فرعون اسی قوم میں اپنے رب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ جو یا تو غیرت اور احساس سے یکسر محروم ہو چکی ہو یا اس کے جذبات میں اس حد تک تلاطم پیدا ہو چکا ہو کہ اُسے عقل کی بات بتانے والے اور حقائق سے آشنا کرنے والے اپنے دشمن نظر آتے ہوں اور دلفریب نعروں کے بل بوتے پر اُسے بیوقوف بنانے والے، ہمدرد اور خیر خواہ دکھائی دیتے ہوں۔

آمروں کے اندر دوسرا خطرناک رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ کسی طرح ملک اور قوم کے اندر بے یقینی، افراتفری، یاس، ناامیدی، انتشار اور طوائف الملوکی کی کیفیت پیدا ہو تاکہ عوام سراسیمہ ہو کر خود بخود اُن کے دام میں آ جائیں۔ آمر یہ کام اُسی ذہنیت سے کرتے ہیں جس ذہنیت سے کہ مچھلیوں اور پرندوں کے شکاری پہلے تو جال پھیلاتے ہیں اور پھر ان آبی جانوروں اور پرندوں کے اندر سراسیمگی پیدا کر کے انہیں جال کی طرف دھکیلتے ہیں تاکہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ زیرِ دام آ جائیں۔ افراتفری کی یہ فضا متعدد طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً ایک معاشرہ جن اقدار پر قائم ہے یا جو روایات اس کے رگ و پے میں سرایت ہو چکی ہیں اُن کے خلاف عوام میں اور خصوصاً نوجوانوں کے اندر شدید جذبۂ نفرت و حقارت پیدا کرنا اور اُنہیں اس امر کا یقین دلانا کہ یہ مروجہ اقدار اور روایات محض اوہام اور بیکار کی زنجیریں ہیں جن کے ذریعے اُن کا استحصال کیا جا تا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جب بھی اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے حصار کو مسمار اور روایات کے بندھنوں کو توڑا گیا تو اس کے نتیجے میں ہمیشہ قوم پر آمریت مسلط ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی اقدار اور روایات ہی انسانوں کے اندر نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں۔ ان کی حیثیت انسانی زندگی میں ایک ایسے داخلی قانون اور ضابطے کی سی ہوتی ہے جن کی انسان خود پیروی پر آمادہ اور پابندی پر راضی (باقی صفحہ ۷۵ پر)

(بقیہ اشارات) ہوتا ہے۔ اور معاشرے کی تنظیم کے لیے کسی قوم کو قانونی جکڑ بندیوں سے کافی حد تک بے نیاز کر دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے جو قومیں بھی اپنی اخلاقی اقدار اور روایات کا احترام کرتی ہیں اُن کے اندر جمہوریت نشوونما پاتی ہے اور جن قوموں پر آمریت مسلط کرنا مقصود ہوتا ہے اُن کے اندر مروجہ اخلاقی اقدار اور روایات کو برباد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جرمنی میں ہٹلر کا عروج اس کی نہایت واضح مثال ہے۔ مارٹن لوتھر نے مسیحیت کا جو نیا تصور پیش کیا اس سے لوگوں میں اس مذہب کی اخلاقی اقدار اور روایات کو پامال کرنے کا شدید رجحان پیدا ہوا۔ مذہب کے اس "مصلح" نے اصلاح کے نام پر مسیحیت کی عمارت کو ڈھا تو دیا مگر اس کی جگہ نئی اخلاقی اقدار اور نئی روایات کا کوئی ایسا ڈھانچہ تعمیر نہ کر سکا جو انسان کے اندر موجود شوریدہ سر اور سرکش انسان کو مہذب اور اخلاقی ضابطے کا پابند بنا سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندر کے بپھرے ہوئے انسان کو کسی نظم کا پابند بنانے کے لیے بے رحم جکڑ بندیوں کا سہارا لینا پڑا۔ ظاہر بات ہے یہ کام کسی بے رحم آمر مطلق کے ہاتھوں ہی سرانجام پا سکتا تھا جو ہٹلر کی صورت میں جرمنی کی سرزمین میں نمودار ہوا۔

اس کے ساتھ ہی ملتا جلتا تخریب کا ایک تیسرا رجحان جو ہر آمر کے اندر بآسانی دیکھا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ملک کے معاشی، معاشرتی اور تعلیمی نظام اور عدل و انصاف کے اداروں اور انتظامیہ کے مختلف شعبوں کو "اصلاحات" کے نام پر تعمیر نو کا کوئی واضح منصوبہ تیار کیے بغیر تہ و بالا کر دیا جائے تاکہ زندگی کے ہر شعبے میں شدید خلفشار رونما ہو جائے اور اس خلفشار کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں جب لوگوں کو اُمید کی کوئی کرن دکھائی نہ دے رہی ہو تو وہ مایوسی کے عالم میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں اور آمر اُن کی اس بے بسی اور بے کسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنے تیار کردہ نظامِ استبداد میں بڑی آسانی کے ساتھ جکڑ دے۔

جو لوگ "اصلاحات" کے نام پر زندگی کے مختلف شعبوں کو آمریت کے تسلط کی خاطر بے تکلف زیر و زبر کرتے رہتے ہیں وہ اپنی اس روش کو جائز ثابت کرنے کے لیے بڑی سادگی اور معصومیت سے یہ کہتے ہیں کہ جب تک کسی بوسیدہ نظام کو مسمار نہ کیا جائے اس وقت تک تعمیرِ نو کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکتی۔ یہ دلیل سراسر

ایک منطقی مغالطہ ہے۔ اس میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اخلاقی اقدار و روایات اور اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبوں کو خواہ اُن کا تعلق عدلیہ اور انتظامیہ سے ہو یا معیشت، معاشرت اور سیاست سے، چونے، گارے اور اینٹوں کی عمارت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ عمارت تو ایک مدت گزرنے کے بعد بوسیدہ ہو جاتی ہے اس لیے اسے مسمار کر کے اس کی جگہ دوسری عمارت تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے مگر اخلاق و روایات کے نظام اور معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچوں کو کبھی یہ ضرورت پیش نہیں آتی کہ انہیں بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اُن کی جگہ یکسر نئے نظامہائے حیات اور بالکل نئے معاشرتی، معاشی اور انتظامی ڈھانچے معرضِ وجود میں لائے جائیں کیونکہ یہ نظام اور ڈھانچے پورے کے پورے کبھی از کار رفتہ اور بوسیدہ نہیں ہوتے۔ یہ انسان کی صدیوں کی کوششوں کے ثمرات ہوتے ہیں جن کی بربادی ہمیشہ نقصان کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی عملاً ناممکن ہے کہ معتقدات و تصورات اور اخلاق و روایات کے نظام کو یکسر نیست و نابود کر دیا جائے۔ حیاتِ انسانی کے ان گوشوں میں بلاشبہ انتشار تو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مگر انہیں بالکل فنا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کا تعلق ان معتقدات، تصورات اور احساسات سے ہوتا ہے جن کے اندر تبدیلی تو لائی جا سکتی ہے مگر ان کا مکمل خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو فرد یا گروہ ان کے اندر مناسب اصلاح کرنے کے بجائے انہیں بالکل برباد کرنے کے درپے ہوتا ہے وہ درحقیقت قوم کو شدید خلفشار میں مبتلا کرتا ہے۔

بالفرض اگر نظامِ حیات کو عمارت پر قیاس بھی کر لیا جائے تو پھر بھی ان آمروں کی "اصلاحی سرگرمیوں" کو کسی لحاظ سے بھی قوم کے لیے مفید اور کارآمد نہیں کہا جا سکتا۔ کسی عمارت کو جس میں کوئی خاندان رہائش پذیر ہو اُسے اُسی وقت ڈھایا جاتا ہے جب اس خاندان کے سامنے عمارتِ نَو کا کوئی اور نقشہ موجود ہو اور اس کی تکمیل کے لیے اس کے پاس مناسب وسائل بھی ہوں۔ جو لوگ بغیر کسی متبادل نقشے اور منصوبے اور وسائل کے عمارت کو مسمار کرنا شروع کر دیتے ہیں ان کا مقصد ان کے مکینوں کو ہراساں اور پریشان کر کے انہیں جبراً بے دخل کرنا یا ان سے من مانی شرائط منوانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ قریب قریب اسی ناپاک عزم کے ساتھ آمر رائج الوقت نظام پر ضربیں لگاتا ہے۔ وہ اصلاحِ احوال کے لیے کوئی جامع اور قابلِ عمل منصوبہ تیار کیے بغیر مروجہ نظام کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے تاکہ عوام پر سراسیمگی اور پریشانی کا عالم طاری ہو اور وہ یا تو کسی کونے میں دبک کر بیٹھ جائیں یا آمر کے سامنے تسلیم و رضا

کی تصویر بن کر زندگی بسر کرنے کا عہد کرلیں۔

اسے قدرت کا عجوبہ کہیے یا کرشمہ کہ اس نے اگر ایک طرف آمروں کے عزائم اور رجحانات میں حالات اور زمانے کے اختلاف کے باوجود یکسانیت پیدا کی ہے تو دوسری طرف اُن کے مزاج اور طرزِ عمل کو بھی کافی حد تک یک رنگ بنایا ہے۔ جذباتیت، لاابالی پن، دروغ گوئی، خودسری، لاف زنی، سنگدلی، طبیعت میں ناہمواری اور غصیلا پن یہ وہ عام صفات ہیں جو ہر آمر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جذباتیت اور لاابالی پن سے وہ دو مختلف نوعیتوں کے کام لیتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے مصنوعی طرزِ عمل سے بسا اوقات عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ مزاج اور جذبات کے لحاظ سے اُن کے بہت قریب ہے بلکہ ان کی سطح پر ہے اس لیے انہیں چاہیئے کہ وہ اسے اپنے حلقے کا ہی ایک فرد سمجھ کر اُس سے محبت کریں۔ دوسرے یہ کہ اس کی اس جذباتیت اور لاابالی پن سے ملک میں بے یقینی کی فضا قائم کرنے میں مدد ملتی ہے اور ہر شخص اور گروہ خوف زدہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کل اس کا کیا حشر ہو۔ دروغ گوئی اور لاف زنی سے عوام کے اندر آمر کا جھوٹا وقار قائم ہوتا ہے اور وہ ایک طلسماتی شخصیت کی حیثیت سے لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ کرتا ہے۔ اس کی سنگدلی اور غصیلے پن کی بنا پر عوام کے اندر دہشت پھیلتی ہے اور ہر فرد اپنی جگہ پر خوف زدہ رہتا ہے کہ کب اس کی شامت آجائے۔

قرآن مجید وہ عظیم المرتبت کتاب جو ملّتِ اسلامی کے وجود کی محافظ ہے اور جس کا محافظ خود خدا ہے۔ مگر دَورِ حاضر میں پاکستان کے محقق جلیل جناب مولانا ظفر اقبال کی تیس سالہ عرق ریزی اور تحقیق کے بعد پیکجز لمیٹڈ کی طرف سے شائع ہونے والا تجویدی قرآن مجید اپنی مثال نہیں رکھتا۔ آرٹ پیپر، اعلیٰ دو رنگی طباعت، جلی حروف، مع پلاسٹک کور اور خوشنما ڈبے میں بند سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ صفحات ۱۰۲۴۔ ہدیہ صرف ۳۵ روپے۔ ڈاک خرچ بذمہ ادارہ۔

تجویدی قرآن مجید حاصل کرنے کے لیے

اِدارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور کو آرڈر دیجیے